ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی*

علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ (۱۹۲۳ء۔۲۰۰۵ء)

صدیاں ہوتی ہیں، وقت کے ایک عظیم عالم (ابن تیمیہؒ) کی وفات پر دمشق کے میناروں سے آواز بلند ہوئی تھی: الصلاۃ علی ترجمان القرآن (ترجمان قرآن کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی)۔ ۲۴؍جنوری ۲۰۰۵ء کو ہندوستان کو بھی حق تھا کہ اس کے گوشہ گوشہ سے بھی یہی آواز بلند ہوتی کہ وقت کے ابن تیمیہ، ترجمان قرآن وسنت، محدث عصر علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ نے اسی دن دنیا کو خیر باد کہا۔ ان کی وفات پر ایک عظیم علمی روایت کا خاتمہ ہوا۔ یہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا کہ اس پر یوں ہی گزر جایا جائے، لیکن مسلمانان ہند اپنے علمی وفکری زوال وانحطاط کے جس مقام پر ہیں، وہاں یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ کسی کو پتہ نہیں چلا کہ کیا ہو گیا۔ اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ ہم ایک عہد فراموش دور میں جی رہے ہیں جہاں پر ہر چیز کو بھلا دیا جاتا ہے، تاہم عوام تو عوام، علما، ارباب مدارس، اسلامی تحریکوں اور اسلامی علوم کے طلبہ کا ایسے گوہر نایاب اور متاع بے بہا کے بارے میں تجاہل، تغافل اور ناآشنائی کا یہ رویہ جس کا ایک عمومی مشاہدہ کیا گیا، ایک ملی المیہ اور ہماری علمی تاریخ کے ایک عبرت ناک باب سے کم نہیں۔ خصوصاً ایسے دور میں جہاں درباری مدعیان علم اور مختلف فرقوں، جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کے قائدین پر زور سیمینار ہوتے ہیں اور اخباری شہرت رکھنے والے ہما وشما پر خصوصی گوشے اور نمبرات شائع کیے جاتے ہیں!!

خاندان: عہد اسلامی میں شمالی ہند میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے، ان میں برہمنوں وراجپوتوں اور گوجروں سے نکلی ہوئی بہت سی برادریاں بھی ہیں۔ انھی میں ایک چودھری برادری بھی ہے جن کا آبائی پیشہ کاشتکاری ہے۔ موضع توڑی ضلع غازی آباد میں سکونت پذیر اسی برادری کے ایک متوسط درجہ کے خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ آپ کے دادا ایک نیک دل اور سیدھے سادے دیندار کسان تھے جنہوں نے خود تو معمولی دینی تعلیم پائی تھی لیکن اپنے بچوں کو اچھی دینی وقرآنی تعلیم سے آراستہ دیکھنے کی بڑی تمنا اور آرزو تھی۔ والد حافظ بشیر احمد علاقہ کے انتہائی جید حافظ وقاری تھے جن کے حفظ کا دور دور تک شہرہ تھا۔ والدہ زبیدہ خاتون بھی نہایت عابدہ زاہدہ خاتون تھیں۔ اوپر کے شجرہ کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ نہ خود مولانا نے کہیں تذکرہ کیا اور نہ وہ شجروں اور نسبتوں وغیرہ کے وہ قائل تھے کہ بقول امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ:

*ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی 110025۔ ای میل: ghitreef1@yahoo.com

''اسلام نے ساری نسبتوں اور امتیازوں کو مٹا کر صرف اپنی ایک نسبت نوع انسانی کو عطا کی اور اس نسبت سے بڑھ کر اور کون سی نسبت ہو سکتی ہے جس کی ایک مسلمان کو تلاش ہو؟ انسان کے لیے معیار شرف جو ہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایت یا رینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہمارے نسب سے ہمارے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں! ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے۔'' (تذکرہ صفحہ ۲۶)

تعلیم وتربیت: مولانا شبیر احمد ازہر نے کم سنی میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں ہی علوم دینیہ کے اکتساب سے فارغ ہو گئے تھے۔ اس وقت کے مروجہ درس نظامی کے پورے کورس، جو ۱۲ سال کو محیط ہوتا تھا، کی تکمیل انھوں نے صرف ۵ سال میں کر لی تھی۔ ان کے خاص استاد مولانا شاہ اختر خان امروہوی تھے جن کے خاص استاد کا نام بھی شبیر احمد تھا اور جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے شاگرد بھی تھے۔ شاہ اختر خانؒ نے ان کو پورا قرآن صرفی و نحوی ترکیب کے ساتھ پڑھایا اور حدیث وفقہ کی منتخب کتابیں خصوصی طور پر پڑھائیں۔ اپنے اس شاگرد پر ان کی خصوصی نظر عنایت تھی۔ وہ اپنے اور شاگرد دونوں کی مناسبت سے کہا کرتے کہ ''شبیر سے لیا اور شبیر کو دے دیا''۔ مروجہ علوم کی تکمیل شاہ اختر خان صاحب سے کرنے کے بعد انھی کی ایما پر جامعہ تعلیم الدین ڈھابیل گجرات تدریس کے لیے جانا ہوا۔ وہاں انتہائی کم عمری کے باوجود اونچے درجوں کی کتابیں پڑھائیں۔ کچھ عرصہ بعد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ہندوستان آئے اور دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر مدرس بنائے گئے تو استاد کے اشارہ پر ڈھابیل سے لوٹے اور دیوبند سے دورۂ حدیث کیا۔ وہاں خاص اساتذہ میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، مولانا فخر الحسنؒ اور حضرت مدنیؒ تھے۔

تدریسی خدمات: دیوبند سے سند فضیلت کے حصول کے بعد آپ نے مختلف مدارس اور اداروں میں علوم اسلامیہ کی تعلیم وتدریس کا آغاز کیا اور تقریباً ۷۵ سال کی عمر ہونے تک ہندوستان کے بڑے اور اہم مدارس میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۳۰ سال سے زائد عرصہ تک صحیح بخاری پڑھائی۔ ان مدارس اور اداروں میں جامعہ تعلیم الدین ڈھابیل، جامعہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ریاض العلوم دہلی، جامعہ امدادیہ مراد آباد، نور الاسلام صدر میرٹھ، جامعہ ندوۃ السنہ کیرالا اور جامعۃ الصالحات رامپور، مدرسہ عربیہ چلہ امروہہ اور دوسرے بہتیرے مدارس اور ادارے شامل ہیں۔ علوم اسلامیہ، قرآن وحدیث، تفسیر، اصول، فقہ، اصول فقہ، فلسفہ ومنطق اور ادب عربی، بلاغت اور علم عروض میں بھی زبردست تبحر حاصل تھا۔ ساتھ ہی طب یونانی، ہنوٹ، گھڑسواری وشمشیر زنی میں بھی انھیں مہارت وحذاقت تامہ حاصل تھی۔ یادداشت اور قوت استحضار اتنی تھی کہ جو چیزیں ۵۰، ۶۰ سال پہلے پڑھی تھیں، وہ بلا کتاب دیکھے پڑھا دیا کرتے تھے۔ ابتدائی درجوں کی تمام کتابیں انھوں نے خود راقم کو پڑھائیں، چنانچہ ان کے اس کمال کا خوب تجربہ ہوا۔ یوں تو تمام علوم کا استحضار تھا لیکن علوم قرآن اور علوم سنت سے خصوصی شغف تھا۔ یہی دونوں زندگی بھر اوڑھنا بچھونا رہے۔

علمی خدمات: اردو عربی اور فارسی لکھنے اور بولنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ عربی اردو بے حد روانی سے اور بے تکان لکھتے چلے جاتے۔ انھوں نے زندگی کے آخری دن تک لکھا۔ ان کے گہربار قلم سے کتاب وسنت کے علوم سے

متعلق درج ذیل شاہکار کتابیں نکلیں:

۱۔تفسیر مفتاح القرآن مکمل اردو جس کے سورۂ آل عمران تک صرف ۶/اجزا ابھی تک طبع ہوئے ہیں، باقی مسودات کی شکل میں ہیں۔اس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت تفسیری روایات پر تحقیقی کلام ہے۔

۲۔الکلم الطیب (قرآنی ڈکشنری)۔اس سے قبل میرٹھ کے مولانا قاضی زین العابدین مرحوم کے ساتھ ایک ''قاموس القرآن'' کوئی ۶۰ برس پہلے بھی ترتیب دیا تھا۔

۳۔مفتاح القرآن (عربی) سورۃ فاتحہ طبع ہوئی، آل عمران تک غیر مطبوعہ ہے۔

۴۔کلمات المثانی (مفردات القرآن) ناتمام

۵۔قرآن کی حجتیں۔(وفات کے وقت تک اس پر کام کر رہے تھے)

۶۔تحفۃ القاری بشرح صحیح البخاری عربی،مکمل (۱۹ جلدیں)

۷۔شرح مسند احمد بن حنبل اردو (۱۶ جلدیں)

۸۔اقوم المسالک شرح موطا مالک (اردو ۶ جلد، ناتمام)

۹۔بخاری کا تحقیقی مطالعہ (بعض احادیث کی تحقیق وتنقید) ۳/اجزا

۱۰۔صحیح مسلم کا تحقیقی مطالعہ (۳/اجزا) ناتمام

۱۱۔تحقیق مشاجرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وواقعہ حرہ۔

۱۲۔حدیث الافک العظیم (اردو میں تفسیر سورۂ نور کے نام سے طبع ہوئی) عربی غیر مطبوع ہے۔

۱۳۔احادیث دجال کا تحقیقی مطالعہ (ظہور مہدی، خروج دجال اور نزول مسیح کی تحقیق)

۱۴۔حدود اللہ (تا وفات زیر تصنیف تھی)۔

شخصی احوال واوصاف: نوخیزی ونوجوانی کی عمر بڑے جوش وولولہ کی اور مجاہدانہ تھی۔صحت نہایت قابل رشک، گھڑسواری، شمشیرزنی اور بنوٹ کے ماہر تھے اور شکار کھیلا کرتے۔۱۹۴۷ء کے مسلم کش فسادات میں (بطور خاص جب گڑھ مکتیسور جل رہا تھا) انھوں نے اپنی قوت بازو، جرأت وشجاعت اور ہمت سے کئی مسلم لڑکیوں کو شر پسند ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ سے بچایا تھا اور ان کے چنگل سے چھڑا کر لائے۔اس کی پوری داستان اپنے ایک ناول غم میں رقم کی تھی (جو افسوس کہ ضائع ہو گیا)۔اسی طرح انہوں نے عربی کے ایک تاریخی ناول و اســلامــاہ کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا لیکن وہ بھی چھپ نہیں سکا۔

۱۷ سال کی عمر میں ہی موضع ٹیالہ (غازی آباد) میں شادی ہو گئی اور چار برس بعد پہلی بچی عمارہ کی آمد ہوئی جو اب حجن آپا عمارہ کہلاتی ہیں۔دوسری بچی کی پیدائش میں اہلیہ کا انتقال ہو گیا تو میرٹھ کے موضع رائدھنہ میں ان کے ماموں چودھری توصیف احمد کی دختر نیک اختر نفیسہ بیگم (میری والدہ محترمہ) سے شادی ہوئی۔مولانا کے بقیہ لڑکے لڑکیاں انھیں کے بطن سے تولد ہوئی ہیں جن میں ہم پانچ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔

علمی امتیازات وخصائص: علوم عربیہ واسلامیہ میں تبحر کے ساتھ ہی علامہ اردو، فارسی وعربی کے ایک بڑے

شاعر بھی تھے۔ انھوں نے جو مختصر دیوان چھوڑا ہے، اس میں اردو کے علامہ فارسی کی بھی بعض غزلیں ہیں۔ فن عروض کے امام تھے۔ اسی طرح نحو وصرف میں بھی بے نظیر مہارت پائی تھی۔ عام طور پر عربی مدارس میں ابتدا کے کئی سال نحو صرف کی تعلیم میں ضائع کیے جاتے ہیں۔ علامہ کا طریقہ تعلیم انتہائی آسان، شگفتہ اور عملی تھا۔ محض ایک سال میں کتابوں کے بجائے کاپیوں پر قواعد ومثالیں لکھوا کر وہ صرف ونحو کی ضروری تعلیم دے دیا کرتے۔ اپنے بہت سے تلامذہ کو انھوں نے اسی طرح تعلیم دی۔ خود راقم نے ان سے ایک سال پڑھ کر عربی چہارم میں داخلہ لے لیا تھا۔

علامہ میرٹھی کی ایک بڑی علمی خصوصیت، جو انھیں معاصرین واقران سے ممتاز کرتی ہے، وہ علوم اسلامیہ اور بطور خاص قرآن وحدیث کا وسیع مطالعہ تھا اور وہ بھی اول درجے کے مصادر ومراجع سے۔ انھوں نے کبھی دوسرے اور تیسرے درجہ کی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ علوم قرآن سے متعلق ہمیشہ متقدمین کی نمایندہ اور بلند پایہ کتابیں اور تفسیریں ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ ابن جریر طبریؒ، ابن کثیرؒ، بیضاویؒ، رازیؒ وزمخشریؒ اور ابو حیان الاندلسیؒ کا مطالعہ کرتے اور مؤخر الذکر کو زیادہ پسند کرتے۔ شاہان دہلی (شاہ عبدالقادرؒ وشاہ رفیع الدینؒ) کے ترجمے انھیں پسند تھے۔ نیز اردو کے سبھی متداول تراجم وتفاسیر کو دیکھا تھا، لیکن سبھی کے بارے میں ناقدانہ رائے رکھتے تھے۔

حدیث کے باب میں، صحاح ستہ اور دیگر امہات کتب پر گہری نگاہ تھی، رجال کے دفتر ازبر تھے۔ مؤطا، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، مسند احمد وبیہقی فتح الباری وتہذیب التہذیب وغیرہ مسلسل مطالعہ میں رہیں۔ ساتھ ہی معاصرین کی چیزیں بھی دیکھتے رہتے۔ شرح مسند احمد بن حنبل کی تصنیف شروع کی تو مولانا عبداللہ رحمانی مبارک پوریؒ شارح مشکوٰۃ اور علامہ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ بخاری پر انتہائی گہری نظر تھی۔ اس کی جلالت قدر کے بارے میں خود لکھتے ہیں: ''کتاب اللہ قرآن کریم کے بعد صحیح بخاری کے علاوہ مجھے کسی کتاب میں دلکشی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ میرا چالیس سالہ مستقل احساس ہے۔'' (میرا مطالعہ، ص ۱۹۰، مرکزی مکتبہ اسلامی)

فقہ میں بھی یہی حال تھا۔ بطور خاص فقہ حنفی کے امہات کا گہرا استحضار تھا، اس لیے بدایۃ المجتہد سے خوش نہ تھے کہ صاحب بدایۃ نے حنفی نقطہ نظر پیش کرنے میں غلطیاں کی ہیں۔ اسی طرح متاخرین ومعاصرین علما کی چیزیں ان کے نزدیک غیر معیاری تھیں۔ علم فقہ پر زبردست گرفت اور مجتہدانہ نظر کے باوجود ان کی دلچسپی اصل میدان قرآن وحدیث اور ان سے متعلقہ علوم تھے جس کو اپنے ایک شعر میں یوں تعبیر کیا ہے:

جز کلام یار ہر تقریر بار گوش ہے　　جز رخ جاناں کوئی منظر نہیں بھاتا مجھے

علمی زندگی کے تین دور: راقم کے خیال میں علامہ کی علمی زندگی کو تین ادوار میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلے دور میں وہ فقہاے حنفیہ کے خوشہ چیں ہیں، لیکن نصوص کے راست مطالعہ وتحقیق اور تطبیق وترجیح کے بعد اگر دوسرے نتیجہ پر پہنچے ہیں تو پورے اعتماد اور جرأت کے ساتھ ان سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور دوسرے مسالک کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی ''اقوم المسالک الی مؤطا امام مالک'' اس کی بین مثال ہے، البتہ حدیث کے مسلسل ومطالعہ وتحقیق نے انھیں تقلید جامد سے دور کر دیا اور کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سلفیت یا عدم تقلید کی طرف قدم بڑھائے۔ رفع الیدین، طلاق ثلاثہ

اور عبادات کے زیادہ تر نزاعی مسائل میں اخیر تک ان کی رائے محدثین کے مسلک سے قریب تر رہی ہے۔ انھوں نے خبر واحد کی ظنیت کے بارے میں فقہا کے نظریہ کا علمی تعاقب کیا۔ (ملاحظہ ہو رسالہ: تقریب المأمول فی حدیث الرسول برنہایۃ التحقیق شرح مندابوبکر صدیقی صفحہ ۱۹ تا ۵۷) اخیر تک ان یہی قطعی تحقیق تھی کہ خبر واحد اگر صحیح ثابت ہے تو قطعی الدلالت ہوتی ہے۔ یہ زندگی کا دوسرا دور تھا۔ تیسرا دور وہ ہے جب انھوں نے علوم حدیث پر بے مثال تبحر حاصل کر لیا، علم الرجال کا وسیع مطالعہ کیا اور قرآن پاک کے مسلسل تحقیقی مطالعہ وتدبر نے فکر ونظر میں زبردست بصیرت پیدا کر دی تھی۔ اب انھوں نے روایت ودرایت کے لحاظ سے ذخیرۂ حدیث پر گہری نظر ڈالی، ایک ایک حدیث کو پرکھا، جانچا، مثالب کو تایا، مطاعن کو دیکھا حتی کہ خود اس فن پر ایک سند اور مرجع بن گئے۔

نقد حدیث: کتب حدیث میں حدیث کی سب سے اہم کتاب صحیح بخاری کو انھوں نے سب سے زیادہ پڑھا اور پڑھایا۔ قرآن کے بعد یہی کتاب انھیں سب سے زیادہ محبوب تھی، لیکن اس کے سلسلہ میں علما کا جو ایک غیر علمی اور خالص اندھی تقلید کا رویہ ہے کہ ''بخاری میں جو کچھ ہے، وہ سب صحیح ہے اور اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی'' اس سے انھیں ذرا بھی اتفاق نہ تھا۔ بخاری ومسلم کی علمی عظمت وجلالت قدر کے پورے اعتراف کے باوجود ان کی سوچی سمجھی اور تحقیقی رائے یہ تھی کہ ان میں بھی متعدد کمزور اور غلط روایتیں جگہ پا گئی ہیں۔ اس رائے کا انہوں نے نہایت جرات سے اظہار بھی کیا، چنانچہ اپنی ''تحفۃ القاری'' میں تفصیل سے ان روایات پر محدثانہ کلام کیا ہے اور ان تحقیقات کا خلاصہ ''بخاری کا مطالعہ'' (۳/اجزا) میں اردو زبان میں پیش کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں نام نہاد اجماع یا جمہور کے اتفاق کی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اسی وجہ سے بعض علمی طور پر کوتاہ قد اور متعصب اہل حدیث علما، علامہ کو بھی منکرین حدیث کی صف میں لے جا کر کھڑا کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ ایسے ہی کم ظرفوں اور کم علموں کے لیے کہا گیا ہے کہ ؎ شعر من بمدرسہ کے برد۔

زندگی کے تیسرے دور میں علامہ کا حاصل مطالعہ یہ تھا کہ اکثر اختلافی مسائل میں فقہاے امصار میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی فقہی بصیرت وامامت بدرجہا فائق ہے۔ ان کی رائے محدثین کے مسلک کے مقابلہ میں زیادہ لائق ترجیح ہے۔ اخیر کی تحریروں میں یہ رجحان صاف محسوس کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فقہاے حنفیہ کی تقلید جامد کرنے لگے تھے، بلکہ متعدد مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے۔

ذوق اجتہاد: کتاب وسنت کے مسلسل تحقیقی مطالعہ نے ان کے اندر اجتہادی بصیرت پیدا کی۔ انھوں نے متعدد مسائل میں جمہور سے کھلا ہوا اختلاف کیا۔ قرأت سبعہ کا مسئلہ، اجماع کا ثبوت، نسخ کا مسئلہ، تحویل قبلہ، واقعہ افک، خبر واحد کی قطعیت کا مسئلہ اور اس کے علاوہ سیکڑوں احادیث اور آیات کی تشریح وتوضیح میں وہ جمہور سے بالکل الگ رائے رکھتے ہیں اور ان کا جرأت کے ساتھ اظہار بھی کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ متاخرین میں ان کے تفردات سب سے زیادہ ہیں تو غالباً بے جا نہ ہوگا اس میں کوئی مبالغہ ہوگا۔ یہ تفردات یا اجتہادی رائیں دراصل ان کی درا کی، وسعت مطالعہ، تخلیقی ذہن، فکری شادابی، حاضر دماغی، علوم کے استحضار اور اعتماد ذاتی کی پیداوار ہیں۔

مسائل کے سلسلہ میں ان کی نظر جزئیات سے زیادہ کلیات پر رہتی تھی۔ فقہی نقطہ نظر میں وسعت تھی۔ ہر حال میں کسی ایک مسلک کی تقلید وتنقید کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ علمی اختلاف وتحقیق ان کی نظر میں علما کی متوارث چیز

تھی۔ چنانچہ انھوں نے محدثین کی رایوں اور فقہا کے اجتہادات سے خوب خوب اختلاف کیا ہے۔ فقہا حدود سے محدود معنی لیتے ہیں۔ علامہ نے اس کو پوری شریعت کے مترادف قرار دیا ہے اور اسی تصور پر ان کی کتاب حدود اللہ مبنی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشاجرات کے سلسلہ میں ان کی رائے جمہور سے الگ ہے۔ مروان، یزید اور حجاج بن یوسف ثقفی کے بارے میں بھی ان کی تحقیق الگ تھی۔ وہ ان حضرات کے اقدامات کو کسی حد تک جواز کی حد میں داخل سمجھتے تھے۔ شیعیت کو وہ اسلام کا سب سے بڑا داخلی انحراف سمجھتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی کتاب خلافت وملوکیت سے مطمئن نہ تھے بلکہ اس مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر ٹھیک وہی تھا جو امام ابن تیمیہؒ اور صاحب العواصم من القواصم قاضی ابن العربیؒ کا ہے۔

شیدائے قرآن: علامہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے، ضیاع وقت سے انھیں بڑی نفرت تھی۔ سفر میں ہوں، حضر میں، شہر میں ہوں یا گاؤں میں، بس ہر وقت مطالعہ غور وفکر، ہر وقت کچھ نہ کچھ تحریر۔ لائٹ موجود ہے تو بہتر، نہ آرہی ہو تو لالٹین کی روشنی کام آئے گی۔ سفر میں زیادہ وقت تلاوت قرآن میں گزارتے، مجلسوں اور جلسوں جلوسوں سے حتی کہ لوگوں کے زیادہ خلا ملا سے بھی وحشت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث اور قرآنیات پر اتنے بڑے بڑے کام انجام دے دیے جو بڑی بڑی اکیڈمیوں اور اداروں کے کرنے کے ہیں۔ ٹرین سے سفر کر رہے ہیں یا بس سے کہیں جا رہے ہیں تو بے تکی اور فضول باتوں کی بجائے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہیں۔ ان کی تلاوت قرآن نری تلاوت نہیں، تدبر کی تلاوت ہوتی تھی۔ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر مستقل پڑھتے رہتے تھے۔ تلاوت کے دوران اکثر آنکھوں سے آنسو ٹپکتے۔ یہی نماز میں قراءت کے وقت ہوتا تھا۔ قرآن ان کے لیے اصل مصدر ومرجع تھا۔ تمام علوم اسلامیہ میں وہ قرآن ہی کو حکم بناتے اور اسی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

نمازوں کے بعد دیر تک مسنون اوراذکار کا اہتمام ہمیشہ رہا۔ جہاں رہتے اور جس کمرے میں بیٹھتے، وہ صبح سے شام تک قال اللہ وقال الرسول کے ترانوں اور تلاوت قرآن کے زمزموں سے گونجا کرتی۔ ان کی نوجوانی کے ایام میں ذرائع مواصلات محدود تھے۔ اس وقت گھوڑے سے یا پیدل سفر کرتے اور دوران سفر بڑی سے بڑی مسافت تلاوت قرآن میں طے کر لیتے۔ ہر رمضان المبارک میں کئی کئی قرآن ختم کرتے۔ طریقہ یہ ہوتا کہ عشا کے بعد تراویح میں الگ قرآن پڑھتے، تہجد میں الگ۔ دن کو حافظ عبدالخالق صاحب (رادھنہ گاوں کی جامع مسجد کے امام اور ہمارے حفظ قرآن کے استاد) کو مستقل کئی کئی پارے سنایا کرتے۔ زندگی کے آخری ایام تک حافظہ قابل رشک رہا۔ قرآن انتہائی پختہ یاد رہا اور اسی شان سے اس کی تلاوت جاری رہی حتی کہ وفات کے وقت بھی قرآن کی تلاوت دیر تک کرتے رہے تھے۔

شخصیت پرستی سے اجتناب: راقم نے اپنے شعور کے بعد تقریباً ۲۰ سالوں سے انھیں مسلسل دیکھا اور برتا ہے۔ مسلمانوں میں شخصیت پرستی ایک مرض کی طرح پھیل گئی ہے۔ مختلف مکاتب فکر، فقہی مسالک، جماعتیں اور تنظیمیں وغیرہ مختلف شخصیتوں کی اسیر ہیں اور انھی کی عینک سے دین کو دیکھتی اور سمجھتی اور سمجھاتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کو سبھی نے پس پشت ڈال رکھا ہے کہ انظر الی ما قال و لا تنظر الی من قال (یہ دیکھو کہ کیا کہا، یہ نہ دیکھو کہ کس نہ کہا) لیکن والد صاحب رحمہ اللہ علیہ کے متعلق یہ عاجز پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ شخصیت پرستی کے مرضی سے

اللہ نے انھیں پورے طور پر محفوظ رکھا تھا۔ ماضی کی طرح اس صدی میں بڑی بڑی شخصیات ہوئی ہیں، لیکن والد صاحب علوم میں رسوخ کے اس درجہ پر تھے کہ ماضی وحال کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے انھیں مرعوب نہیں دیکھا۔

اپنے اساتذہ کا ذکر احترام سے کرتے، لیکن دو استادوں مولانا اختر شاہ خانؒ امروہوی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کا تذکرہ بڑے ہی احترام کے ساتھ کرتے۔ انھی دونوں سے زیادہ متاثر بھی رہے۔ ماضی قریب کے علما میں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے بہت مسائل میں اختلاف کے باوجود ان کا ذکر بلند کلمات میں کرتے کہ برصغیر میں قرآن پر براہ راست غور وفکر اور اکتساب کی مبارک فضا کا آغاز انھی سے ہوا اس چیز کو بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے تھے۔ قدیم مفسرین میں ابوحیان اندلسیؒ کو زیادہ پسند کرتے اور طالبان قرآن کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتے۔ قرآن سے امت کی دوری کا بڑا سبب اسرائیلیات کے رواج، تصوف کی خرافات کے ساتھ واعظوں کی داستان گوئی اور راویان حدیث کی روایت بازی کو قرار دیتے تھے۔ ماضی کے علما وائمہ میں سب سے زیادہ قائل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے تھے بلکہ یہ تک فرماتے کہ امامت کے حقیقی مصداق صرف ابوحنیفہؒ ہیں۔ تاہم متاخرین حنفیہ پر خوب تنقیدیں بھی کی ہیں۔

شان قلندری: علامہ ایک مفلوک الحال گھرانہ میں پلے بڑھے، لیکن ابتدا ہی سے غیرت، توکل، خودداری اور قلندری کی شان تھی جس میں زندگی بھر فرق نہیں آنے دیا۔ جب نئے نئے پڑھ کر وطن واپس آئے تو بعض رشتہ داروں اور احباب کے کہنے پر للیانہ گاؤں میں ایک مدرسہ ازہر العلوم کھولا۔ کچھ عرصہ بعد ایک مسودہ (بیان اللسان) میرٹھ کے قاضی زین العابدینؒ کو فروخت کر کے ۱۹۵۰ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ کلمہ حق کہنے اور غلط کو غلط بتانے میں انتہائی بے باکی اور جرأت کی دولت سے مالا مال تھے۔ اسی دوران علماء دیوبند کا ایک حلقہ اور ان کے مسترشدین مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر ناروا قسم کی تنقیدیں کرنے اور گمراہ پروپیگنڈے میں مشغول تھے، لیکن مولانا نے نہ صرف یہ کہ اپنے استادوں اور مشائخ سے اس معاملہ میں کھل کر اختلاف کیا بلکہ بہت سی چیزوں میں پوری جرأت وقوت کے ساتھ جماعت اور مولانا مودودیؒ کی حمایت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاقہ کے بعض فتنہ باز مولویوں اور پیروں نے عوام کو ان کے خلاف بھڑکا دیا اور انھیں ''مودودیا'' مشہور کر دیا۔ لوگوں نے مدرسہ کا تعاون چھوڑ دیا۔ حج سے واپس آنے کے بعد اس صورت حال کا سامنا ہوا تو مدرسہ کو خیر باد کہہ کر پھر سے درس وتدریس اختیار کر لی۔ حیدر آباد گئے، وہاں کریم نگر میں جماعت اسلامی کی نگرانی میں دار الہدیٰ کھولا گیا جس کے پہلے استاد آپ ہی تھے۔ وہیں جماعت سے باقاعدہ وابستگی ہوئی اور رکن بنے، لیکن خالص علمی افتاد طبع ہونے اور فکری اختلاف کی بنا پر جلد ہی اس تحریک کے جھمیلوں سے نکل آئے۔ اس کے بعد مولانا مجیب اللہ ندویؒ صاحب کے ساتھ مل کر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کی بنا وتکوین میں بھی حصہ لیا۔

زندگی بھر مدارس اسلامیہ میں قلیل تنخواہ پر علوم اسلامیہ کی خدمت کی۔ کبھی سرمایہ داروں اور ثروت مندوں کا رخ نہیں کیا۔ کبھی جماعتوں، تنظیموں اور ملی اداروں کے ارباب حل وعقد کی جبہ سائی اور کفش برداری کا تصور بھی حاشیہ خیال میں نہیں آیا۔ کتابیں لکھتے رہے، الماریوں میں مسودات کی شکل میں جمع ہوتی رہیں، لیکن یہ نہیں ہوا کہ کسی کی جھوٹی خوشامد یا جھوٹی تنقید کر کے اپنی تحریر چھپوانے کا سامان کریں، چنانچہ مولانا اسعد مدنیؒ صدر جمعیت علماء ہند (جو شیخ زادہ بھی ہیں) کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ تفسیر میں مودودیؒ صاحب پر تنقید کی جائے تو طباعت کے مصارف ہم اٹھائیں

گے۔ جماعت اسلامی حلقہ آندھرا پردیش کا وفد یہ تجویز لے کر آیا کہ اپنی تفسیر سے مولانا مودودیؒ پر تنقیدیں نکال دیں تو وہ اس کی اشاعت میں تعاون کریں گے، اس وفد کو بھی لوٹا دیا، مگر عدل وانصاف، امانت ودیانت اور علمی وقار وغیرت پر آنچ نہ آنے دی۔ مدارس کے ارباب اہتمام سے بھی اکثر تصادم ہوجاتا۔ وہ چاہتے کہ آپ ٹھیک تقلیدی مزاج کے ساتھ ہی کام کریں، لیکن علامہ شان قلندری وبے نیازی کے ساتھ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے، نہ مرعوب ہوتے نہ اپنی کسی رائے سے دست بردار ہوتے۔ معاصرین میں یہ شان بے نیازی ان کا امتیاز تھی۔

تزکیہ واحسان: علامہ میرٹھیؒ کے اساتذہ وشیوخ میں بیعت واردات کی مستحکم روایت ہے، لیکن تحقیقی ذہن، شخصیت پرستی سے نفور اور قرآن سے شغف، یہ ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے، اس لیے جہاں تک راقم کو معلوم ہے، وہ کسی حلقہ ارادت سے وابستہ سکہ بند صوفی نہ تھے۔ البتہ ان کے جن احوال ومقامات کا مشاہدہ ۲۰ سالوں سے ہوتا رہا ہے، ان کو سامنے رکھ کر بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ذات نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عشق، تقویٰ وپرہیزگاری، انابت اور رجوع الی اللہ کی جو کیفیت ان کو حاصل تھی، وہ موجودہ دور کے مروجہ حلقائے طریقت ومشیخت کے لوگوں کو شاید نصیب ہوتی ہو۔

تزکیہ وسلوک ''ہو ہو'' کرنے یا الا اللہ کی بے روح ضربیں لگانے، بزرگوں کے عرس اور ان کے مزاروں پر چلہ کشی کا نام نہیں، وہ تو دراصل عرفان ذات، جذبہ وشوق اور خدا کے لیے جذبات محبت سے عبارت ہے۔ اس کے لیے جذبہ شکر اور والہانہ عقیدت سے ہی سلوک کا جوہر تیار ہوتا ہے۔ محبت کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو بندہ کو اپنے خالق ومالک اور پالن ہار سے ہوتی ہے اور اس محبت کے بغیر تو ایمان بھی معتبر نہیں۔ کسی شخص کے ظاہری احوال اور کاموں کو دیکھ کر اگر اس کے باطن کے بارے میں رائے قائم کرنا درست ہو تو مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ حب مال، حب جاہ اور تنگ دلی سے ان کے قلب کو صاف کردیا گیا تھا اور وہ ان شاء اللہ و من یوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون (جو لوگ نفس کی تنگی سے بچا دیے گئے، وہی کامیاب ہیں۔ تغابن:۱۶) کے خاص مصداقوں میں سے ہوں گے۔ ان کے چہرہ سے پاکیزگی جھلکتی اور پیشانی سے نور کی بارش ہوتی تھی۔

حادثہ وفات: ڈیڑھ سال قبل نماز کو جاتے ہوئے راستہ میں گر گئے تھے۔ دو چار دن تو کچھ معلوم نہ ہوا، پھر دائیں ٹانگ میں درد محسوس ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ جانچ کرانے پر معلوم ہوا کہ معمولی سا فریکچر ہے۔ علاج ہوا لیکن فائدہ نہ ہوا تو ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا۔ آپریشن ہوا۔ اس کے بعد توقع تھی کہ ٹانگ ٹھیک ہوجائے گی، لیکن آپریشن سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' والا معاملہ ہوگیا۔ اس بیماری میں تقریباً چودہ مہینے بستر پر رہے۔ حوائج ضروریہ بھی بستر پر کرائے جارہے تھے۔ اس کے باوجود لکھنے پڑھنے کا کام جاری تھا۔ قرآن کریم کی تلاوت وتدبر کے معمول میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۴؍جنوری ۲۰۰۵ء کو یکا یک ایک حادثہ پیش آیا کہ آپ کے دوسرے صاحبزادے (میرے برادر مکرم) جناب مولانا انظار الحقؒ صاحب (بانی مدرسہ ازہر العلوم رادھنہ) اچانک علی الصباح حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے۔ انہوں نے عمر عزیز کی صرف ۴۲ بہاریں دیکھیں۔ یہ تمام اولاد میں آپ کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ شروع سے آخر تک تعلیم بھی آپ نے ہی دی تھی۔ اس حادثہ فاجعہ نے زیادہ صدمہ پہنچایا۔ عید کے دوسرے دن طبیعت ناساز ہوئی تھی۔

قرآن پڑھوا کر سنا، افاقہ ہوگیا۔ تیسرے دن بھی طبیعت خراب ہوگئی۔ پھر سورہ یٰسین پڑھوا کر سنی، طبیعت بحال ہوگئی۔ ۲۴ رجنوری کو اچھی دھوپ نکلی تھی۔ سارے دن دھوپ میں بیٹھے ہشاش بشاش تھے۔ ''قرآن کی حجتیں'' پڑھوا کر سنی۔ پھر لکھنے میں مشغول ہوگئے۔ دوپہر میں مجھے طلب کر کے اپنے مسودات دکھائے۔ اپنا ذخیرۂ کتب، صحاح اور ان کی شرحیں، تفسیر مفتاح القرآن اور تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری کے مسودے خود اٹھ کر اور الماریوں کے پاس جا جا کر دیکھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ان کی آخری زیارت ہے۔ یہ کتابیں ہی کل زندگی کا سرمایہ تھیں۔ مغرب کے بعد لوگ ملاقات کے لیے آتے رہے، عشا کی نماز پڑھ کر روز مرہ کے اوراد و وظائف پڑھے۔ پھر کچھ دیر کے لیے سو گئے اور اچھی نیند سوئے۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے آنکھ کھلی تو وضو کر کے تلاوت قرآن شروع کی اور ایک گھنٹہ تک کرتے رہے۔ پھر بڑے بھائی سے مدرسہ ازہر العلوم کے بارے میں باتیں کیں۔ دو بجے سے بعد تکلیف شروع ہوئی۔ دوا وغیرہ لی۔ مقامی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے انجیکشن لگائے۔ اس کے بس دو تین منٹ بعد ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پورے قصبہ میں صف ماتم بچھ گئی۔ آفتاب علم غروب ہوا، وقت کا امام الحدیث چلا گیا۔

جا چکی خاموش ہو کر شمع ہوئے آسماں　　عالم بالا میں پایا ہے سراغ آرزو (ازہر)

متعدد علمی مجلّات اور تحقیقی رسالوں نے آپ کی وفات پر تعزیتی نوٹ اور شذرے شائع کیے جن میں البعث الاسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ، الرشاد اعظم گڑھ، ماہنامہ ترجمان جدید دار العلوم (دہلی) اور اردو بک ریویو خاص ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کی حیات اور فکر و فلسفہ پر منتخب کتابیں

- **زندہ رود** (علامہ اقبال کی مفصل سوانح حیات) از: ڈاکٹر جاوید اقبال [قیمت: ۹۰۰]
- **اقبال۔ تشکیلی دور** از خرم علی شفیق [صفحات: ۵۸۵۔ قیمت: ۳۲۵]
- **تجدید فکریات اسلام** (انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ) مترجم: ڈاکٹر وحید عشرت [صفحات: ۲۹۰۔ قیمت: ۲۰۰]
- **خطبات اقبال نئے تناظر میں** از: ڈاکٹر محمد سہیل عمر [صفحات: ۲۳۴۔ قیمت: ۱۵۰]
- **خطبات اقبال: تسہیل و تفہیم** از: ڈاکٹر جاوید اقبال [صفحات: ۲۳۵۔ قیمت: ۲۵۰]
- **معارف خطبات اقبال** از: ڈاکٹر محمد آصف اعوان [صفحات: ۳۰۴۔ قیمت: ۲۵۰]
- **اقبال کا تصور اجتہاد** (مجموعہ مقالات) مرتب: ایوب صابر، محمد سہیل عمر [صفحات: ۲۸۰۔ قیمت: ۲۰۰]
- **اقبال اور قرآن** از: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان [صفحات: ۱۱۱۸۔ قیمت: ۴۰۰]
- **اقبال اور محبت رسول** از: ڈاکٹر طاہر فاروقی [صفحات: ۲۴۷۔ قیمت: ۱۷۵]
- **اقبال دشمنی۔ ایک مطالعہ** از: ڈاکٹر محمد ایوب صابر [صفحات: ۳۷۵۔ قیمت: ۱۷۰]
- **میرا بزم بر ساحل کہ آنجا** از: ڈاکٹر محمد سہیل عمر/احمد جاوید [صفحات: ۶۰۔ قیمت: ۵۰]

خطبات اقبال پر سید سلیمان ندویؒ سے منسوب تنقید کا ناقدانہ جائزہ

—— مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہیں ——